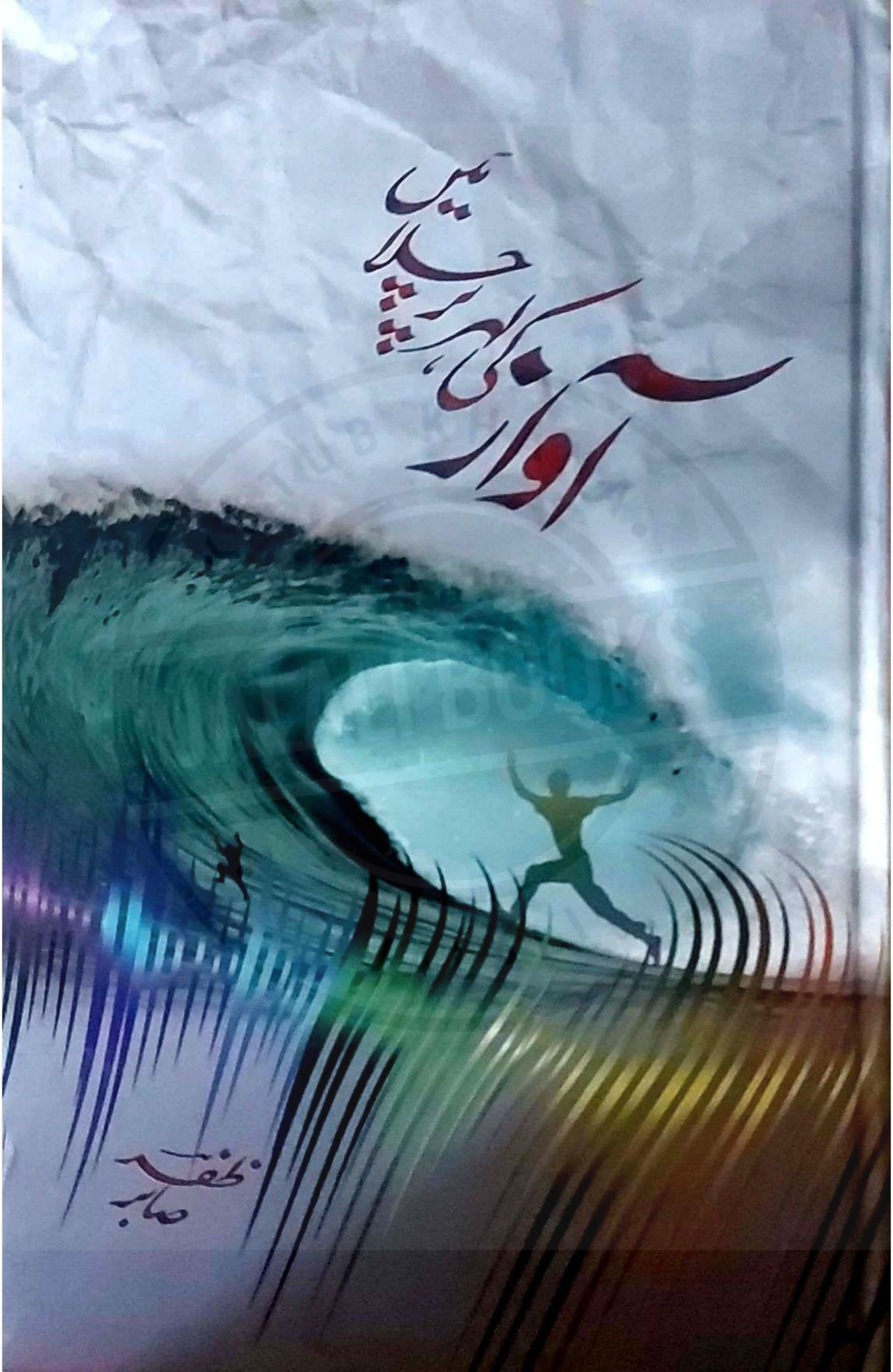

آواز کی ہشت جہتیں
صابر ظفر

آواز کی لہر پر چلا مَیں

(اکتالیسواں شعری مجموعہ)

صابر ظفر

رنگِ ادب پبلی کیشنز

ترتیب وانتخاب

طاہر نظامی

جملہ حقوق : شاعر کی اولاد کے نام محفوظ

کتاب : آواز کی لہر پر چلائیں

شاعر : صابر ظفر (تمغۂ امتیاز)

Mob. 0300-2101223
sabirzafar11@gmail.com

سرورق : سجاد خالد

اشاعت : بار اوّل، یکم جنوری 2019ء

طابع : خرّم پرنٹنگ پریس، کراچی

قیمت : 300 روپے

احمد مبارک کے نام

ترتیب

◆◆◆

رنگوں سے وصال کیا ہُوا تھا
تصویر میں پھول کھل اٹھا تھا

پرچھائیں، کپاس چُن رہی تھی
آکاش اسے جھک کے دیکھتا تھا

وہ اور کسی کی زندگی تھی
بے وجہہ مَیں سانس لے رہا تھا

جاں، ہونٹوں پہ رکھ کے ہونٹ، دے دی
یا میرے خیال میں خلا تھا

ہم دونوں گناہ گار اُدھر تھے
جنّت کے کنارے، رتجگا تھا

پڑھتا تھا اسے مَیں شب سے پہلے
وہ کاسنی شام کی دعا تھا

جاگا تھا ظفر وہ میری لَو میں
اُس کا تو چراغ بجھ چکا تھا

سرِ پیشانئ دل بوسہ ترا ثبت ہوا
بے سبب تو نہیں پیری میں، مجھے خبط ہوا

گر ہیں کُھل جائیں وجود اور عدم کی شاید
رازِ اشکالِ تحیّر سے اگر ربط ہوا

دل میں آنا تھا ترا مثلِ ہبوطِ آدم
چھو نہ لیتا مَیں قدم تیرے، کہاں ضبط ہوا

اصل الفاظ بھی لکنت نے عجب نقل کیے
جو بھی نازل ہوا افسانہ، وہ بے ربط ہوا

کہاں ملتا ہے ظفر نعشِ دریدہ کا سراغ
غم نہ ہوگا مرا دیوان اگر ضبط ہوا

وہ دوست نہ دوستی پرانی
اب تک ہے وہی کمی پرانی

جاتا ہوں گئے ہوئے دنوں میں
ملتی نہیں زندگی پرانی

ڈھونڈوں مَیں بجھا کے قمقموں کو
وہ شمع کی روشنی پرانی

اب تک ہے وہی خدا پرانا
اب تک وہی بندگی پرانی

تاحشر الگ نہ ہوں گی
آوازیں جو ہیں نئی پرانی

اک یاد ہے سطحِ بحرِ دل پر
کائی کی طرح جمی پرانی

لگتی ہے ظفر نئی نئی سی
ہر چیز کبھی کبھی پرانی

خاک ہوں، خاک پہ لازم، مہ واختر سے گریز
درِ دلدار سے نسبت، درِ دیگر سے گریز

چشمِ عشاق میں صد رشک ہے تہذیبِ جمال
یار کے رخ پہ فدا، غیر کے پیکر سے گریز

دیکھ کر نامۂ اعمال کی تقصیر خطی
ہے روا لغزشِ خطاطئ محضر سے گریز

روح سے روح کو چھونے کوئی آیا ہی نہیں
سوچیے، ایسے کوئی کرتا ہے دلبر سے گریز

میں نے دیکھا ہے ظفر کو، کبھی تم بھی دیکھو
سطوتِ عجز میں گُم، نخوتِ منبر سے گریز

اجڑا مجھے منظروں نے دیکھا
میں بس نہ سکا، گھروں نے دیکھا

معدوم ہوا ہے شورِ دریا
خاموش سمندروں نے دیکھا

میں اُن سے بکھر چکا زیادہ
کچھ بکھرے ہوئے پَروں نے دیکھا

انجام سے بے خبر ہیں شاید
آئینوں کو پتھروں نے دیکھا

دیکھا نہ کسی نے جانبِ دار
ہم جیسے ہی خود سروں نے دیکھا

دیکھا ہے جمالِ یار کس نے
جس طرح پیمبروں نے دیکھا

گزرا وہ ظفر دراز قامت
اِتنا تو صنوبروں نے دیکھا

میں دشت میں جو برائے تلاشِ آب پھرا
بندھا نے آس مری، آگے اک سراب پھرا

گزشتہ شب تو بہت یادگار شب گزری
کہ خالی آنکھوں میں وہ خوش خرامِ خواب پھرا

رکھی تھی جس نے کڑی شرط، ستر پوشی کی
ہماری بزم سے نکلا تو بے حجاب پھرا

عجیب بے بسی آوارگی میں آ گئی تھی
ہمارے ساتھ کوئی صورتِ عذاب پھرا

سبیل دیکھنا چاہی جو پیاس بجھنے کی
مری نظر میں سفیدی کی صورت، آب پھرا

نہ بیٹھنے دیا مکتب میں اہلِ دنیا نے
لیے لیے مَیں ظفر عشق کی کتاب پھرا

یوں ہی نہیں سائے ڈھل رہے تھے
سورج کی روش پہ چل رہے تھے

کچھ رنگ بدل دیے تھے مَیں نے
کچھ رنگ مجھے بدل رہے تھے

کچھ گردشیں مہربان بھی تھیں
ہم جن کے سبب سنبھل رہے تھے

اک قربت خاص کی طلب میں
ہم دور کہیں نکل رہے تھے

اے قلزمِ عشق! ہم بھی تیری
تادیر اُبھرتی چھل رہے تھے

کِھل اٹھتے تھے، دیکھتے ہی جَل کو
کیا ہم بھی کبھی کنول رہے تھے

کرنے کو سخن ظفر ہوا سے
کچھ پتّے نئے نکل رہے تھے

اپنی جلوت ہے الگ، گوشہ نشینی ہے الگ
عیشِ دنیا کی طرح لذتِ دینی ہے الگ

اس طرف آؤ گے تو دل کے قریب آؤ گے
بدگمانی نہ کرو، بات یقینی ہے الگ

کچھ نہ چھوڑا مرے جینے کے لیے ظالم نے
یار چھینا ہے الگ، زندگی چھینی ہے الگ

مرگ اور زیست کے دونوں ہی نشے ہیں لازم
زہر پینا ہے الگ، مے مجھے پینی ہے الگ

ڈھانپتا رہتا ہوں عریانی کو عریانی سے
اور پوشاکِ دریدہ مجھے سینی ہے الگ

بات کس کس کی خدائی کی ظفر کی جائے
آسمانی ہے الگ اور زمینی ہے الگ

دُور اُس کو ہوا سے، گزر سکا کون
خوشبو کی جگہ ٹھہر سکا کون

کون اپنی خوشی سے جی سکا ہے
اور اپنی خوشی سے مر سکا کون

تُو سب کو پناہ دینے والا
پَر دل میں ترے، اتر سکا کون

آئے نہ جو دھیان میں کسی کے
اس خاکے میں رنگ بھر سکا کون

آ جاں سے ظفر گزر کے دیکھیں
اور پوچھیں کہ یُوں گزر سکا کون

اتنی طرفیں ہیں کہ اطراف سے ڈر لگتا ہے
بعض اوقات تو اہداف سے ڈر لگتا ہے

عمر بھر پیتے رہے گھاٹ سے گدلا پانی
اب تو ہر موجۂ شفاف سے ڈر لگتا ہے

کچھ ڈراتا ہے ہوس کار نگاہوں کا ہجوم
کچھ ترے حسن کے اصراف سے ڈر لگتا ہے

کہیں دے دے نہ سزا جرمِ محبت کی ہمیں
اس ستم گار کے انصاف سے ڈر لگتا ہے

جو بھی دیکھے وہ ظفر شک کی نظر سے دیکھے
آج کل اپنے ہی اوصاف سے ڈر لگتا ہے

اتنا تو جنوں پسند تھا مَیں
دیوار تھی وہ، کمند تھا مَیں

دیوانہ ضرور تھا اگرچہ
لیکن ذرا ہوش مند تھا مَیں

جاتا تھا جہاں خیال میرا
کچھ اُس سے سِوا بلند تھا مَیں

اب صورتِ رنگ اڑ رہا ہُوں
تصویرِ قفس میں بند تھا مَیں

کھاتا تھا جو تازیانۂ عشق
منہ زور ظفر سمند تھا مَیں

ابھی کھینچا تھا دم اور زندگی کی ہر تگ و دَو گُم
میں ظاہر از سرِ نو ، ہو کے بھی ہوں از سرِ نَو گُم

طلسمی آبجو تھی اور اترتی تھی پرَی کوئی
ہوئی اس خواب کے اندر ہماری روح کی لَو گُم

کوئی صبحِ بشارت تھی، کُھلا تھا جو درِ زنداں
سنہری دن میں ہوتی جا رہی تھی پھوٹتی پَو گُم

میں غافل تو نہیں تھا شام کے کھلتے دریچوں سے
نجانے ہوگیا کیسے محبت کا مہِ نَو گُم

ابھرتے ڈوبتے تھے ہم ظفر خلوت کی موجوں میں
نجانے کون سی رو میں ہوئی تھی وصل کی رَو گُم

کہنے کو تو سات آسماں تھے
چھوتے ہوئے اور بے کراں تھے

کتنا وہ سبک سفر تھا جب ہم
خوشبو کی طرح رواں دواں تھے

کچھ اور نظر نہ آرہا تھا
کچھ تھا تو وہ نور کے نشاں تھے

کیا عشق تھا، جب پلٹ کے دیکھا
ہم تم تھے وہیں، کبھی جہاں تھے

کاٹی ہے انہی میں عمر ساری
دو دل کہ جُڑے ہوئے مکاں تھے

ہم سیڑھیاں چڑھ رہے تھے دونوں
اور اوجِ سفر میں خوش گماں تھے

تھے سلسلے ایسے قربتوں کے
پوچھا نہ کبھی کہ تم کہاں تھے

دیوار کوئی ظفر نہیں تھی
کچھ وصل کے رنگ درمیاں تھے

کوئی نماز نہ تھی، جب وضو کیا نہ گیا
مگر لبوں سے وہ بوسے کا ذائقہ نہ گیا

اثاثہ جاتِ دل و جاں کا کچھ حساب نہیں
لُٹا تو کیا گیا اسباب اور کیا نہ گیا

اکیلے سانس بھی لینا نہ تھا گوارہ مجھے
میں دم بخود رہا، جب تک وہ دل میں آ نہ گیا

میں جا رہا تھا بہت دور اس کی خلوت سے
مگر جو اس نے کہا تھا مجھے، نہ جا، نہ گیا

چلا بھی جاتا تھا مَیں خواب گاہ میں اس کی
پھر اتنی گردشیں آئیں کہ وہ زمانہ گیا

نہ پوچھ آمد و رفتِ خیالِ نامحرم
کہ آیا آیا نہ آیا، گیا گیا نہ گیا

اسی لیے تو ظفر عاقبت کی فکر نہ تھی
ہمارے دل سے وہ غافل شدہ خدا نہ گیا

وہ شام تھی اور ڈھل رہی تھی
یا آخری سانس چل رہی تھی

آثارِ وصال رُونما تھے
پَو، چادرِ شب بدل رہی تھی

تک سکتے تھے ہم وجود اپنے
ایسے کوئی شمع جل رہی تھی

ساکت تھا خیال کا وہ منظر
جاں، جس کے لیے مچل رہی تھی

احساسِ جمال ہو رہا تھا
خواہش کوئی دل میں پل رہی تھی

کچھ رنگ تو لڑکھڑا رہے تھے
تصویر مگر سنبھل رہی تھی

میں کر نہ سکا پرستش اس کی
بَس دل سے دعا نکل رہی تھی

میں جھوم سکا نہ ساتھ اس کے
وہ شاخ تو پھول پھل رہی تھی

ہم ایسے ظفر بچھڑ رہے تھے
تقدیر بھی ہاتھ مَل رہی تھی

ایسا نہیں کہ موت کا میلہ نہیں لگا
اس دشت میں، دوبارہ وہ خیمہ نہیں لگا

اس تیر کو کبھی نہیں سمجھا تمہارا تیر
جب تک وہ میرے سینے سے خود آ نہیں لگا

حالاں کہ بے کنار نہیں تھا وہ دشتِ عشق
لیکن کسی کنارے بھی پیاسا نہیں لگا

دیکھی نہیں ہے بارشِ خوں کس نگاہ نے
کس کا وجود ہے، جسے نیزہ نہیں لگا

جو سانس لے رہا تھا شہیدوں کے بعد بھی
وہ عمر بھر کسی کو بھی زندہ نہیں لگا

اک واقعہ ہے اور بہت دردناک ہے
تم نے بھلا دیا، مجھے اچھا نہیں لگا

دل ڈوبتا رہا مرا، کس کس خیال میں
جب تک وہ شخص پار ظفر جا نہیں لگا

ملبوس اگر مسک رہا تھا
وہ جسم عبث لچک رہا تھا

منزل ہی نصیب میں نہیں تھی
وہ ساتھ تو دور تک رہا تھا

بارش نے دلائی تھی توجہ
پہناوے سے تن جھلک رہا تھا

ایماں تو مَیں لاچکا تھا اُس پر
وہ ہے کہ نہیں، یہ شک رہا تھا

دریا، مرا دل تھا جس سے کوئی
پانی کی طرح چھلک رہا تھا

کیا اپنی تھی اشتہا، نہ پوچھو
پھل تھا کہ ہنوز پک رہا تھا

اپنے تو وجود بجھ چکے تھے
وہ چاند مگر چمک رہا تھا

خاطر میں نہ لائی کوہ زادی
پتھر تھا جو دل، لڑھک رہا تھا

ہونے کو ذرا سی دیر میں راکھ
انگار سا دل، دہک رہا تھا

ڈوبی ہوئی آنسوؤں میں شب تھی
دن نکلا تو دل سسک رہا تھا

منظر سے الگ تھا مَیں اگرچہ
دنیا کو مگر کھٹک رہا تھا

دکھلائی تھی راہِ عشق جس نے
مجھ سا ہی کوئی بھٹک رہا تھا

وہ ہم سفر اور وہ مسافت
میں اس کی طرح ہی تھک رہا تھا

ساعت جو وداعِ یار کی تھی
مشکل سے مَیں دیکھ سک رہا تھا

اک عشق تھا، وہ بھی زندگی سے
لمحے کی طرح سرک رہا تھا

سپنے سے نکل چکا تھا باہر
میں جس کی طرف لپک رہا تھا

کیوں چھوڑ دیا تھا اس چمن کو
پنچھی تو وہاں چہک رہا تھا

دیوار اٹھا کے خواہشوں کی
دل تھا کہ ظفر دَھسک رہا تھا

تم دیکھنا اگر کہیں بستی میں رَن پڑا
دشمن پہ مَیں بھی وار کروں گا جو بَن پڑا

گنجان تیرگی ہے مگر دیکھنا مجھے
تارا سا ایک، چادرِ شب سے ہوں چھن پڑا

اٹھتے تھے جن کے پاؤں، یہاں سے وہ اٹھ چکے
اب میں ہی اس نواح میں ہوں، خستہ تن پڑا

سن لے اگر کوئی تو اٹھا لے اُسے ضرور
تازہ سماعتوں کے لیے ہے سخن پڑا

کھولا جو مَیں نے یاد کے مقتل کا دَر ظفر
لاشہ تھا ہر خیال کا، بے پیرہن پڑا

صحرا میں جو رات ہو گئی ہے
بے نام حیات ہو گئی ہے

رو کے، جو مہِ تمام آئے
آئینے سے بات ہو گئی ہے

قدموں میں جو بچھ گئی ہے تیرے
وہ راہِ نجات ہو گئی ہے

باوصف ہزار گردشوں کے
محور، تری ذات ہو گئی ہے

کچھ دن سے ظفر یہ زندگانی
اشکوں کی برات ہو گئی ہے

میں جو آتا ہوں نظر تنہا، یہ تنہائی نہیں
کتنی لاشیں ہیں مرے اندر جو دفنائی نہیں

کوئی مرتا ہے تو لگتا ہے کہ مرجاتا ہوں مَیں
زندگی پوری طرح میری طرف آئی نہیں

کون سنتا ہے کسی کی، انتہائے جبر میں
شورِ مرگِ آرزو ہے اور شنوائی نہیں

سربکف ہوں گل زمیں کی بازیابی کے لیے
اک ٹھکانے کو بدل لینا تو پسپائی نہیں

قید ہے حالات کے زنداں میں وہ صابر ظفر
جانتا ہوں مَیں کہ میرا یار ہرجائی نہیں

اپنے ہی سخن سے مشک بُو تھا
لگتا ہے کہ مَیں نہیں تھا، تُو تھا

مہکے کئی ماورائی غنچے
جس وقت خیال بے نمو تھا

وحشت میں بھی خوش سلیقگی تھی
ہر تار الگ الگ رفو تھا

جب تک تھی تلاشِ کوئے جاناں
میں خاک تھا اور کُو بکُو تھا

ناواقفِ عشق تو نہ تھا مَیں
سینے میں دلِ پُر آرزو تھا

مے خانہ کھلا ہوا تھا دل میں
ہونٹوں سے لگا ہوا سبو تھا

اب تیرے خیال میں نہیں ہوں
کچھ پڑتا ہے دھیان، مَیں کبھو تھا

تصویر میں جو پسند آیا
وہ رنگ نہ تھا، مرا لہو تھا

تم رکھتے نہیں نگاہ، ورنہ
اوّل کی طرح وہ ہُو بہُو تھا

سمتوں کے دراز فاصلے تھے
میں ایک طرف وہ چار سُو تھا

کھویا ہوا مَیں بھی تھا اگرچہ
وہ میری قدیم جستجو تھا

میں ڈوبنا چاہتا تھا جس میں
شیشے میں وہ عکسِ آبجو تھا

لَو، شمعِ وداعِ یار کی تھی
اور اس کا فروغ سرخرو تھا

ساتھ اس کے ہی عمر بھر چلا مَیں
ہر پل جو ظفر رمیدہ خُو تھا

نظّارگی بھی نینوں کے زینوں کو منع ہے
دیکھیں وہ بام، خاک نشینوں کو منع ہے

لکھّا ہوا ہے ان کے مقدر میں ڈوبنا
ساحل کا حال پوچھیں، سفینوں کو منع ہے

اک دوسرے کی دھڑکنیں گننے کی آرزو
سنتے ہیں، دو دُکھے ہوئے سینوں کو منع ہے

تقدیر جن کی پوروں سے ہوتی ہے رونما
ان انگلیوں سے مس ہوں، نگینوں کو منع ہے

دیوار و در سے جس کے، قفس کا گمان ہو
ایسے مکاں میں رہنا، مکینوں کو منع ہے

ہجرت کی بات اور ہے، ہجرت تو ہو چکی
سیرِ چمن، پناہ گزینوں کو منع ہے

چھوڑ آئیں اپنا سر ہی سرِ دار اے ظفر
سجدہ اگر ہماری جبینوں کو منع ہے

کچھ صبر کچھ انتظار کر لے
اک سجدہ تو سمتِ یار کر لے

ملنا ہے جو اصل زندگی سے
سانسوں کے بھنور کو پار کر لے

دکھ عشق کا، سامنے رہے گا
رخ کوئی بھی اختیار کر لے

اب رہ گیا بجھ میں کتنا پانی
یہ اشک مرے، شمار کر لے

ہم تجھ کو بھلا نہیں سکیں گے
صابر ظفر اعتبار کر لے

یہاں نہیں ہے اماں تو یہاں سے ہجرت کر
کسی طرح قفسِ پاسباں سے ہجرت کر

اگر وہ تجھ کو بچاتا نہیں ہے مرنے سے
تو اس کے ناحیۂ لامکاں سے ہجرت کر

میں کیا بتاؤں، جہانِ خراب کے اندر
قیام کر تو کہاں کر، کہاں سے ہجرت کر

شکوہِ شامِ ہویدا نہیں ہے تیرے لیے
ستارہ ٹوٹا ترا، کہکشاں سے ہجرت کر

تُو چاہتا ہے سمجھنا اگر ہمارا ملال
زمیں پہ آ کسی دن آسماں سے ہجرت کر

یہ سرزمیں تو یہاں سے کہیں نہ جائے گی
ظفرؔ مَیں کیسے کہوں اپنی ماں سے، ہجرت کر

اب شکل نہ کوئی کوزہ گر دے
واپس مجھے میری خاک کردے

تشہیرِ ستم، تمہاری ہوگی
بہتر ہے کہ میری لوح بھردے

چھولوں کوئی کنگرہ ازل کا
اتنی سی تو مہلتِ سفر دے

میں جا گروں اپنے گھونسلے میں
اتنی تو مجالِ بال و پر دے

یہ دربدری درست لیکن
جاکے جہاں مرسکوں وہ در دے

کھا سکتا ہوں فریب کچھ اور
تُو کوئی نیا خدا اگر دے

مت ایسے رُلا ٹھہر ٹھہر کر
دکھ دے تو ظفر کو عمر بھر دے

سنو کہ میری خموشی بیاں سے دور نہیں
بکھر رہے ہیں جو گل، باغباں سے دور نہیں

ہے واقعہ، کوئی پانی کسی کو پینے نہ دے
وگرنہ پیاسے تو آبِ رواں سے دور نہیں

وہ جاں نثار جو سانسوں کے ساتھ چلتے ہیں
شکستہ رو ہیں مگر کارواں سے دور نہیں

ہر آنے والے کو عیسیٰ نفس سمجھتے ہیں
یہ اہلِ شہر کہ جاں کے زیاں سے دور نہیں

خدا کرے کہ ظفر سب اسیر آن ملیں
دُعائے نیم شبی، لامکاں سے دور نہیں

میں نے کئی کھڑکیوں سے جھانکا
جھرمٹ تھا وہی ستارگاں کا

جوڑا تو فقط اجل نے جوڑا
ٹوٹا ہوا زندگی کا ٹانکا

ملنا کسی اور دائرے میں
آنا کسی اور مہرباں کا

ہر رات ہے جیسے ہجر کی رات
ہر وقت ہے وقت امتحاں کا

رکھوالا تھا وہ ظفر کہ جس نے
بھٹکی ہوئی خواہشوں کو ہانکا

آزاد ہر ایک رُخ ہے جاں کا
ہم نُور ہیں اپنے خاک داں کا

اک میں جو قفس میں ہوں تو کیا ہے
اُڑتا ہے پَرا ، پرندگاں کا

دراصل یقین کا سفر ہے
تشکیک میں گھومنا گماں کا

احسان دلوں کا ہے دلوں پر
ہونا کسی یاد کے نشاں کا

رشتہ مری روح سے ظفر ہے
مٹی میں گندھے ہوئے جہاں کا

سارے لشکر سے مجھے ایک طرف کرتے ہوئے
لے گیا جان مری سانس حذف کرتے ہوئے

دیکھتا ہوں جو یزیدی ہے حکومت اب بھی
یا علی کہتا ہوں، رُخ سوئے نجف کرتے ہوئے

پاسباں مرنے سے محفوظ یہ گھر ہو شاید
ایک عرصہ ہوا، نابود ہدف کرتے ہوئے

کاغذاتِ غمِ تنہائی دیئے ہیں اس نے
ساتھ اک موت کے پروانے کو لف کرتے ہوئے

وار کرنے سے نہیں چوُکتا دشمن پہ ظفر
اپنے اسباب کی سیدھی کوئی صف کرتے ہوئے

الہام، خواب، یاد، اشارہ، خبر، خیال
مقدور کچھ نہیں تو ہے جانے کدھر خیال

سوچا گیا تجھے تو حقیقت ہوئی عیاں
پیدا ہوا ہے تیرے تصوّر سے ہر خیال

نازاں ہوں مَیں کہ مدحتِ مولا مرا نصیب
تائیدِ ایزدی سے ہوا معتبر، خیال

دلدار طے شدہ وہی توصیف طے شدہ
لکھّے ہوئے ہی لکھے گئے بیشتر خیال

آتے ہیں مجھ سے مانگنے، دوشیزگی کی داد
سوکھے ہوئے شجر کی طرح بے ثمر خیال

لذت تھی گمرہی میں تو منزل تھی بے نشاط
ہر آن روکتا رہا، ہر موڑ پر خیال

وحشت میں روز و شب کی عبادت سے بے نیاز
جائے تری طرف تو اٹھائے نہ سر، خیالؔ

افسوس میں نے رول دیا عشق میں اسے
لاتا رہا تھا ڈھونڈ کے کیا کیا گہر، خیال

چھوڑ آئے اس نگر کو جہاں عشق مر گیا
جاتا نہیں ہے اب تو اِدھر سے اُدھر خیال

اک نقشِ رہ گزار ہیں، مٹ جائیں گے ہم آپ
کچھ تو قدم سنبھال کے چل، کچھ تو کر خیال

سوچوں پہ اختیار ترے بعد جب نہیں
لے جائے مجھ کو جانے اڑا کے کدھر، خیال

سائے کی جستجو میں بہت دور تک چلا
بادل مگر تھا واہمہ، لیکن شجر، خیال

دل گردِ ہجر میں جو اٹا تو پکار اٹھا
میں نے عبث کیا تھا اسے ہم سفر خیال

شام آئی تو گریز، سحر آئی تو گریز
اس کا کہ جس کا رکھا تھا شام و سحر خیال

آخر ترے خیال کے آگے ٹھہر گیا
پہلے بھٹکتا پھرتا رہا در بدر خیال

ویسے تو آنے والوں کا تانتا بندھا رہا
لیکن وہ تُو کہ جس کا رہا عمر بھر خیال

بے کل رہا ہمیشہ اسی خشک و تر کے بیچ
کوئی خیال خشک تھا اور کوئی تر خیال

آخر انہی کی قید میں ٹوٹے تمام خواب
دیوار و در کو کرتا رہا مَیں جو گھر خیال

شاید اسی لیے ہوں خیالوں میں گم ابھی
آیا نہیں ہے مجھ کو ابھی تک امر خیال

اکثر غلط خیال تھے، اکثر تھے جھوٹے خواب
سچ ہوتے کم ہی دیکھے گئے خواب اور خیال

بے عشق زندگی تو ہے بے موت مردنی
صابر ظفر خیال ارے صابر ظفر خیال

وحشت نہ ہو شہرِ بے اماں سی
جا ، ڈھونڈ رہا ہوں لامکاں سی

شاید مجھے ہم سفر بنالے
آتی ہے جو موج، رائیگاں سی

اُٹھّیں نہ قدم کھنڈر سے آگے
آئے کوئی بُوئے خانماں سی

یہ منصفِ مرگ نے کہا ہے
مجرم ہے ازل، ابد ہے پھانسی

لب کُھلتے تو کچھ خروش اٹھتے
وہ خلقِ خدا تھی بے زباں سی

محفل تھی مگر اجڑ چکی تھی
منزل تھی مگر تھی بے نشاں سی

حسرت ہی ظفر رہی ہمیشہ
عورت کوئی ہوتی میری ماں سی

اشکوں سے جو ہم تم آشنا ہیں
سمجھو کہ تلاطم آشنا ہیں

دیکھے تو سہی وہ مسکرا کے
ہم کتنے تبسم آشنا ہیں

ہونے کی نہیں کوئی حقیقت
سچ یہ ہے، توہّم آشنا ہیں

ہم گفتگو اس نظر کی سمجھیں
چپ ہیں کہ تکلم آشنا ہیں

اتنا بڑا جھوٹ کم سنا ہے
افلاک ترّحم آشنا ہیں

بس اتنا ظفر فلک کو جانیں
کچھ کچھ مہ و انجم آشنا ہیں

ایک پرچھائی سرسرائی ہے
جیسے منزل قریب آئی ہے

وہ ملا تو لگا کہ جیسے یہ عشق
ابتدائی بھی انتہائی ہے

اڑ رہے ہیں جو رنگ چاروں طرف
یہ بھی تصویر سے رہائی ہے

پھر ترے عشق نے مرے اطراف
ایک پرکار سی گھمائی ہے

تم جو اتنا مہک رہے ہو ظفر
کس کی خوشبو سے آشنائی ہے

وہ الگ ہے جو نارسائی ہے
عشق نے خود بھی خاک اڑائی ہے

دل تری یاد میں ہے سجدہ ریز
یاد گیری بھی جبّہ سائی ہے

جانتا ہوں کہ تُو ہے انجانا
اجنبیت بھی، آشنائی ہے

تُو ہے موجود جس تصور میں
وہ تصور بھی ماورائی ہے

جی اٹھا ہوں ظفر کہ پھر کوئی یاد
دل کے خلوت کدے میں آئی ہے

مصروفِ تلاشِ رفتگاں ہوں
اور پوچھ رہا ہوں مَیں کہاں ہوں

آواز سنائی جو نہیں دی
میں اس کی طرف رواں دواں ہوں

کرتی ہے دھنک تلاش مجھ کو
میں کون سے رنگ میں نہاں ہوں

جھونکا ہوں کوئی ہوا کا، لیکن
خوشبو کے مزاج پر گراں ہوں

دروازہ کھلا ہے دلبری کا
آجاؤ یہاں کہ مَیں یہاں ہوں

جلتے ہوئے دن کی خامشی پر
میں شامِ سخن کا سایباں ہوں

تُو جس میں کہیں نہیں مِلا ہے
وہ عمرِ عزیز رائیگاں ہوں

راکھ اپنی کریدتا ہوں خود ہی
میں اپنے زیاں پہ مہرباں ہوں

جب جب مجھے لے پناہ میں وہ
لگتا ہے مجھے کہ جاوداں ہوں

قسمت میں نہیں کوئی کنارہ
میں ایک بھنور کا بادباں ہوں

آغاز سے رونما ہے انجام
میں آگ ہوں راکھ ہوں دھواں ہوں

وہ مجھ سے لپٹ کے روئے، جیسے
میں آخری فردِ کارواں ہوں

ہونے کا ظفر یقیں نہیں ہے
اور ہوں بھی اگر تو بس گماں ہوں

جب شہر سے دشت مل رہا تھا
اک ریت کا پھول کھل رہا تھا

تھا جس کا خیال ساتھ میرے
پلکوں کا وہ سایہ ہل رہا تھا

ہونٹوں پہ ہَوا کے، زندگی بھر
افسانۂ آب و گل رہا تھا

جب یاد سے سانس چل رہی تھی
کیوں سینے میں پھر یہ دل رہا تھا

وہ میرے خیال میں نہ آکر
سنتا ہوں ظفرؔ، خجل رہا تھا

ہر پل سے بچھڑ چکے جو پل ہیں
کہتے ہیں یہی کہ ہم اٹل ہیں

رکھ لیں ہمیں دل کی طشتری میں
ہم آپ کے صبر ہی کا پھل ہیں

چلتے نہیں لمحے ساتھ میرے
کہتے ہیں ہمارے پاؤں شل ہیں

ڈھیلی ہوئیں اپنی ساری گرہیں
نکلے ہوئے اپنے سارے بل ہیں

لہریں بھی بدل رہی ہیں کروٹ
ہم بھی کوئی جاگتا کنول ہیں

یہ حال بتا نہیں رہا ہے
کل تھے کہ آنے والا کل ہیں

کہتے ہیں وہ گل بدن کہ ہم تو
صابرؔ ظفر آپ کی غزل ہیں

سازینۂ ماہ و سال چپ تھا
یعنی مرا ہم خیال چپ تھا

سسکی سی کبھی کبھی ابھرتی
خلوت کدۂ وصال چپ تھا

کیا میری مجال، بولتا مَیں
جب وہ شیریں مقال چپ تھا

دو لخت کِیا تھا آئنے کو
کہنے کو وہ ایک بال چپ تھا

اڑتی ہوئی ریت نوحہ گر تھی
صحرا میں ظفر غزال چپ تھا

وطن پرستوں کو رہنا ہے تان کر سینہ
اور اصل جینا ہے، دشمن کو مار کر جینا

نظر نہ آئے جنہیں یہ زمیں لہو میں تر
سخن طراز وہ میرے لیے ہیں نابینا

برائے حفظِ حجاباتِ عصمتِ مادر
پیو کہ جامِ شہادت اگر پڑے پینا

اچھال دینا ہوا میں ہر ایک چیتھڑے کو
میانِ رزم، گریباں کبھی نہیں سینا

ملیں گے اور کئی دن نہ لاپتا افراد
جو دے گی طولِ ستم، بَن رہی ہے کابینہ

تم اس کو اپنی سکونت سے دور دفن کرو
رکھے جو دل میں ظفر کوئی پاسباں کینہ

کیفیّتِ عشق ہے دوامی
یعنی ہے کھلی ہوئی غلامی

تجھ لب کا کہا ہوا اٹل ہے
پھر کس لیے آئیں یہ پیامی

آتی ہے وہی ہمیں سمجھ میں
تجھ چشم کی ہو جو خوش کلامی

منزل کرے سہل آخرت کی
اس دہر میں تیری خوش خرامی

رہتے تو ہیں بت کدے میں لیکن
ہم ہیں ظفر اہلِ دل کے حامی

دل نے اُس دل رُبا کو دیکھا ہے
یعنی کچھ کچھ خدا کو دیکھا ہے

منزلیں جس کے گرد گھومتی ہیں
ہم نے اس نقشِ پا کو دیکھا ہے

ایک موجود کی زیارت سے
ہم نے اک ماورا کو دیکھا ہے

جانے وہ کون ہے کہ جس کے لیے
اپنے لب پر دعا کو دیکھا ہے

اس کی بخشش ہوئی محبت سے
ہم نے روزِ جزا کو دیکھا ہے

دیکھنا سہل کر دیا جس نے
اسی مشکل کشا کو دیکھا ہے

جب سے دیکھا ہے زندگی تُو ہے
ہر فنا میں بقا کو دیکھا ہے

سانس میں سانس آ رہی ہے ظفر
صرف اتنا ہوا کو دیکھا ہے

لب بستہ ہوں، کیا سوال چاہوں
کر پاؤں دعا، مجال چاہوں

جینے نہیں دیتے بے خدا لوگ
رحمت تری لازوال چاہوں

جو آج کی کربلا پہ چپ ہے
کیا مَیں تری ایسی آل چاہوں؟

جو روح کی بارگاہ ڈھا دے
ایسا نہ کوئی وبال چاہوں

تُو کتنا قریب آ گیا تھا
ماضی کی طرح کا حال چاہوں

جاؤں کسی اور کی طرف کیوں؟
تُو ہے تو مَیں کیوں مثال چاہوں

جاتی ہو ظفر تو جان جائے
میں خیر کا ہر خیال چاہوں

دل عشق سے مالا مال چاہوں
ہر ہجر میں اِک وصال چاہوں

تُو سالگرہ اگر منائے
ہر سال اک اور سال چاہوں

سوچوں نہ کبھی کسی کی بابت
بس ایک ترا خیال چاہوں

جُز تیرے جو حل نہ ہو کسی سے
ایسا ہی کوئی سوال چاہوں

چُپ سادھ لوں انجمن میں لیکن
تجھ سے مَیں سخن بحال چاہوں

بتلائے نہ جو کہ تُو ہے منزل
اس نقش کو پائمال چاہوں

کچھ اس کے سوا طلب نہیں ہے
دل کی ذرا دیکھ بھال چاہوں

رُوداد سُنوں رمیدگی کی
جنگل میں کوئی غزال چاہوں

مجھ سے نہ بچا سکوگے مجھ کو
خود اپنا اگر زوال چاہوں

جو میری طرح ہی تجھ کو سوچے
ایسا کوئی ہم خیال چاہوں

آگے درِ یار آرہا ہے
شاید تبھی نرم چال چاہوں

دل چاہیے، ایسا چاہنے کو
چاہوں تو بہت کمال چاہوں

کام آئے جو وقتِ رخصتِ یار
تھوڑا سا ظفر ملال چاہوں

میں نے بھی ادھر کی خاک پھانکی
وہ نار جدھر سے گزری بانکی

بہتر تھا رہِ وفا میں مرتے
جو عمر بسر کی، رایگاں کی

جو بھولے ہوئے ہیں گھر کا رستہ
باتیں کریں دوسرے جہاں کی

اس حال کا روکھا پن تو کم ہو
کچھ بات کرو گزشتگاں کی

بدلیں گی ظفر یقیں میں اک دن
جتنی بھی ہیں حالتیں گماں کی

معبد تھا کہ مسجد تھی صنم خانہ کہ کعبہ
جیسا تھا، رہا ویسا ہی یہ دل کا خرابا

مسنون دعاؤں کی طرح ذکر ترا ہو
مذکورِ زمانہ ہے فقط شور شرابا

دنیا نے تو آنسو بھی مرے چھین لیے ہیں
اب سوکھا لیے پھرتا ہوں آنکھوں کا دوآبا

میں نے تو اسی قید میں نیندیں ہیں گنوائیں
یہ شام و سحر ہیں کوئی زندانِ دو خوابا

کرتا ہوں ظفر ایسے طوافِ درِ جاناں
حلقہ کیے رہتے تھے وہ جس طور صحابہ

خیرات سے جب رہا وہ خالی
کشکول میں سو گیا سوالی

اب عشق کی لوح بھر چکی ہے
اب زندگی رہ گئی خیالی

مجھ سے نہ بتائی جا سکے گی
وہ بات اداس کرنے والی

اب اس کے ثمر ہیں اور مَیں ہوں
جھکتی چلی جا رہی ہے ڈالی

سب رنگ پلٹ کے آچکے ہیں
تصویر کی ہو چکی بحالی

اب عشق کا رونا رویئے آپ
قسمت کو تو رو چکی رُدالی

کب آ کے گری ہے وہ زمیں پر
جو سانس ہَوا میں ہے اُچھالی

کہتے ہیں اسی کو رتجگا کیا
تاروں بھری رات کی ہے کالی

دل تھا کہ بڑھا تھا مجھ سے آگے
میں چُھو تو نہیں سکا تھا جالی

گرتے ہوئے دیکھ کر مجھے، وقت
بچّوں کی طرح بجائے تالی

کیسی یہ ہَوا ظفر چلی ہے
خوشبو کی ہوئی ہے پائمالی

کب عشق سے دل نہال ہوگا
کب حال یہ حسبِ حال ہوگا

کب سجدۂ نیم شب کی صورت
خلوت میں ترا خیال ہوگا

کب داخلِ باغ ہونا اپنا
خوشبو کی طرح بحال ہوگا

کب اپنی روش پہ سب چلیں گے
کب سبزہ نہ پائمال ہوگا

کب سانسیں ظفر چلیں گی مل کے
کب جینے کا احتمال ہوگا

بادل بھی جسے ترس رہا تھا
وہ اشکِ طرب برس رہا تھا

ہے یاد ہمیں کہ ساتھ تیرا
اے زندگی! یک نفس رہا تھا

اک تُو ہی وہاں نہیں تھا قیدی
ہر عشق پسِ قفس رہا تھا

توقیرِ حیات گھٹ رہی تھی
ساتھی کوئی بوالہوس رہا تھا

جب عشق ظفر ہوا تھا مجھ کو
میں پل میں کئی برس رہا تھا

کچھ حسن آرائیاں بھی دیکھیں
کچھ ان کی خدائیاں بھی دیکھیں

سرشار بھی دیکھا خلوتوں میں
روکھی تنہائیاں بھی دیکھیں

دیکھا جسے بے وجود ہوتے
اس کی پرچھائیاں بھی دیکھیں

قربت میں وصال ہوتا ہوگا
ہم نے تو جدائیاں بھی دیکھیں

رنگ اُن کا غضب تھا ملگجا سا
رخسار پہ جھائیاں بھی دیکھیں

ہم بھی کبھی آشنا تھے جن سے
شکلیں وہ پرائیاں بھی دیکھیں

جن پر تھا ظفر دوئی کا پَرتو
کچھ ایسی اکائیاں بھی دیکھیں

چلا گیا ہے جدھر دن ادھر چلے جاؤ
اور اب تو ہو بھی چکی شام، گھر چلے جاؤ

یہ راستے تو یونہی کل بھی منتظر ہوں گے
یہاں سے دُور کسی بھی نگر چلے جاؤ

وہ ایک ہم کہ تمہیں زندگی سمجھتے ہیں
اور ایک تم ہو کہ منہ پھیر کر چلے جاؤ

جہاں میں آنے کا مطلب سمجھ میں آیا یہی
کہ آؤ بے خبر اور بے خبر چلے جاؤ

جو خاک اُڑتی چلی جائے، جانبِ منزل
تم اس کے ساتھ ہی صابر ظفر چلے جاؤ

اُن آنکھوں میں خواب رکھ دیا تھا
میں نے کُھلا باب رکھ دیا تھا

پتّوں میں چھپا لیا تھا خود کو
جنگل نے حجاب رکھ دیا تھا

یوں پار چلی گئی تھی خوشبو
پانی پہ گلاب رکھ دیا تھا

ہونٹوں نے کِیا سوال جب بھی
بوسے سا جواب رکھ دیا تھا

اشک اس کے جو دیکھے وقتِ رخصت
واپس اسباب رکھ دیا تھا

سانسوں میں ظفر رکھیں جو سانسیں
جینے کا نصاب رکھ دیا تھا

چاہے ہو وہ نیم گرم یا گرم
آغوش تری رکھے خدا گرم

سوجاؤں مَیں گہری نیند کچھ دیر
اک خواب ہو کاش آپ سا گرم

اٹّھا ہے جو شعلہ رُو جہاں سے
تاحشر رہے گی اب وہ جا گرم

دونوں کی غضب ہے گرم جوشی
ایک اجنبی ایک آشنا گرم

سورج کو تھی ڈوبنے کی جلدی
تھی گرم لہو سے ، کربلا گرم

جس شب جہاں ہوگی سردمہری
کردوں گا وہاں وہ رتجگا گرم

جو لے گئی اس کو سوئے منزل
وہ خاک تھی اس کے زیرِ پا گرم

صابر ظفر آگ اگل رہا ہے؟
آتی ہے جو اس قدر ہَوا گرم

پہنوں جو خیال کی کھڑاؤں
ہر انت پہ جا رکھوں مَیں پاؤں

تُو میرے قریب آ رہا ہے
اب دُور نہیں ہے سُکھ کا گاؤں

وہ شام بھی یادگار تھی شام
تھوڑی سی دھوپ تھوڑی چھاؤں

دنیا یہ نہیں تھی جِس کی دنیا
پھرتا رہا درمیاں گپھاؤں

کس نام سے مَیں ظفر پکاروں
اس کے ہیں نجانے کتنے ناؤں

آتش کی لکھت سے تپ رہے ہیں
ہم لوحِ جہاں پہ چھپ رہے ہیں

لگتا ہے اسے خبر نہیں ہے
ہم جس کے لیے تڑپ رہے ہیں

جینا ہے ہمارا، بس یہ جینا
اے زندگی تجھ میں کھپ رہے ہیں

کافی ہے وہ موسمِ خزاں میں
تھوڑا بھی جو ہم پنپ رہے ہیں

بس ایک ظفرؔ ہے عشق اپنا
بس ایک ہی نام جپ رہے ہیں

تن ہرا کرتے ہوئے لمحے گزرتے ہی گئے
جمع ہوتے گئے ہم اور بکھرتے ہی گئے

ہم نے چاہا تھا درِ یار کی جانب لے جا
زندگی ! ہم ترے انکار سے مرتے ہی گئے

یہ الگ بات کہ تصویر بنا پائے نہ ہم
کسی خاکے میں کوئی رنگ تو بھرتے ہی گئے

اپنی قسمت میں یہی رنجِ سفر لکھا تھا
ہم جو پاتال کے زینوں سے اترتے ہی گئے

ہم سے لکھا نہ گیا متنِ سخن کا کوئی
پھر بھی کچھ حاشیہ آرائی تو کرتے ہی گئے

راس آئی بڑی مشکل سے ہمیں تنہائی
اور پھر ہم رخِ تنہائی سے ڈرتے ہی گئے

آسمانوں پہ قفس تھے جو زمینوں جیسے
بال و پر اپنے ظفر ہم تو کترتے ہی گئے

جتنی بھی جہاں اکائیاں ہیں
سمجھیں وہ یہی، خُدائیاں ہیں

اُڑتی ہیں یہ دونوں ایک ڈھب سے
افواہیں ہیں یا ہوائیاں ہیں

آغوش میں جس طرح دھنک ہو
تھامی ہوئی یُوں کلائیاں ہیں

احساسِ جمال جو سمیٹا
اپنی تو وہی کمائیاں ہیں

ہیں یاد نگارشاتِ ہجراں
جو تُو نے ہمیں پڑھائیاں ہیں

الواحِ حیات کی قسم ہے
یہ سانسیں تری لکھائیاں ہیں

جیتے ہیں تجھی کو دیکھ کر ہم
ہر جا تری رونمائیاں ہیں

سب محو ہوا ہے ٹوٹے دل سے
بس یاد ظفر جدائیاں ہیں

ہم چلتے تو ہوتے ہم قدم تم
اب کتنے بدل گئے ہیں ہم تم

سنتے ہو نہ تم مری کہانی
ہوتے ہو نہ واقفِ الم تم

بے دین ہی اب تو ہوگئے ہو
کھاتے تھے کبھی مِری قسم تم

آنکھوں میں نہیں ٹھہرتا کاجل
رکھتے ہو اب اِتنی چشم، نم تم

لکھنی ہے ظفر مری سزا اور
کیوں توڑتے ہو ابھی قلم تم

یُوں وصلِ ازل کی بھُکھ[1] رہی ہے
خالی کوئی جیسے ککھ[2] رہی ہے

چلتا رہا جس کے سائے سائے
ہر پل تری یاد رُکھ[3] رہی ہے

دیتی رہی اک اجل گواہی
سُکھ کی آخیر دُکھ رہی ہے

مرتے ہوئے، خامشی کے دکھ میں
تیری آواز سُکھ رہی ہے

دوری ہے ظفر اب اُس سے اتنی
تکتے ہوئے آنکھ دُکھ رہی ہے

1-بھوک...... 2- کوکھ...... 3-درخت

ہم دونوں ہی چپ رہا کریں گے
بولیں گے جو دل، سُنا کریں گے

یہ رات اسی لیے بنی تھی
دل دھڑکیں گے، رتجگا کریں گے

ہم سیپیاں خواہشوں کی چُن کے
خُود کو گہر آشنا کریں گے

وہ ہونٹ جو ہوں گے ثبت دل پر
ہم جشن کوئی بپا کریں گے

روحوں پہ جو ہوگا عشق نازل
عشّاق خدا خدا کریں گے

اس بار تمام دکھ نئے ہیں
اس بار نئی دعا کریں گے

جب روندنے آئے گا زمانہ
خاک اپنی اُڑا دیا کریں گے

ہر دکھ کی دوا ہے، پَر مسیحا
اس دل کا علاج کیا کریں گے

خاموش رہیں گے شہر میں ہم
صحرا میں ظفر صدا کریں گے

منتظر رہتے ہیں سپنے کہ انہیں تُو دیکھے
ٹمٹماتے ہیں کہ بجھتے ہیں یہ جگنو دیکھے

قیس تھا، وہ بھی کہانی میں نظر آیا تھا
اک زمانہ ہوا، اس دشت میں آہو دیکھے

ہاتھا پائی کی اذیت نے جدا کر ڈالا
ایک بازو کو کہاں دوسرا بازو دیکھے

کون سی لہر میں بھرنا ہے اسے زہرِ وصال
سرسراتا ہوا اک سانپ لبِ جُو دیکھے

وصل کی طرح ترا ہجر بھی بخشش ہے تری
کیا مری آنکھوں میں تُو نے کبھی آنسو دیکھے

دیکھ مَیں دیکھ رہا ہوں اسی صورت تجھ کو
ہیر کے روپ کو جس ریجھ سے رانجھو دیکھے

قوتِ شامّہ اک چشمِ تجسّس ہے ظفر
آتے جاتے ہوئے دلدار کی خوشبو دیکھے

چاہے کسی گھاٹ لگ نہ پاؤں
میں تیرے بھنور میں ڈوب جاؤں

تُو نے مجھے عمر بھر جگایا
آ مَیں تجھے ایک شب جگاؤں

بن جائے جو ہم سفر تری یاد
ممکن ہے ترے قریب آؤں

ہر بار ہی جستجو نئی ہو
ہر بار نیا فریب کھاؤں

کردی گئی مجھ پہ تو زمیں تنگ
وہ جا ہی نہیں جہاں سماؤں

بن جاؤں سراب کا سفینہ
اور دشت نورد ڈھونڈ لاؤں

یہ صرف خیال کا سفر ہے
میں پھر بھی ظفر قدم بڑھاؤں

اک اک پتھر جھنجھوڑتا ہے
فرہاد پہاڑ توڑتا ہے

دیکھا ہے سلوک باغباں کا
رَس بھرنے پہ رَس نچوڑتا ہے

ہے ریگِ رواں سے آشنا عشق
صحرا میں اکیلا چھوڑتا ہے

مر دیکھو اگر ہے تھل میں مرنا
کب کوئی مُہار موڑتا ہے

میں پھر بھی تکوں پلٹ پلٹ کے
دل توڑ کے کون جوڑتا ہے

غافل مری نعش سے ہے خلقت
سگ ہے کہ اِسے بھنبھوڑتا ہے

جان اُس کے جنون پر ظفر وار
دیوار سے سر جو پھوڑتا ہے

جو لمس کوئی بھی چُھو نہ پایا
وہ مجھ میں سمایا، سایا سایا

گھوما مَیں جہاں کے دائرے میں
پھر دائرہَ جہاں گھمایا

چوموں وہ سلائیاں، جنہوں نے
کاجل تری آنکھ میں لگایا

بیعت کروں اس کے ہاتھ پر مَیں
جس کا تجھے ہاتھ چُھونا آیا

وہ عشق کرے کلام مجھ سے
جس نے تجھے بولنا سکھایا

میں اس کے لیے بھی ہوں دعا گو
جس نے مری روح کو دُکھایا

اس کا ہوں ظفر غلام، جس نے
بوسہ ترے ہونٹ پر بسایا

خوشبو سے نہال ہوگئے ہم
پھر خواب و خیال ہوگئے ہم

ماضی کے شکستہ عکس چن کر
آئینۂ حال ہوگئے ہم

تھے گرمِ سفر تو گرم تھا خون
ٹھہرے تو نڈھال ہوگئے ہم

رنگوں میں جو رنگ کھوگئے تو
تصویرِ وصال ہوگئے ہم

ظاہر ہوئے پہلے لمحہ لمحہ
پھر ماہ و سال ہوگئے ہم

آیا نہیں کچھ بھی عمر بھر ہاتھ
ٹوٹا ہوا جال ہوگئے ہم

پہلے ظفر اس کو دکھ سے دیکھا
پھر ایک سوال ہوگئے ہم

عدو کے سامنے شمشیر سا علم ہو کر
محاذِ عشق پہ آیا ہوں تازہ دم ہو کر

جو جاں نثار ادھر سے ادھر بکھر سے گئے
دوبارہ آن ملے آشنائے غم ہو کر

ہوئے اسیر کہ جو پنچھیوں کے جھرمٹ تھے
زیادہ طاقتِ پرواز دیکھی، کم ہو کر

ہیں اس زمیں پہ ابھی رونما ہمارے وجود
ستم تو مٹ گیا اک آخری ستم ہو کر

ظفر شہیدوں کے جذبے کبھی نہیں مرتے
لہو سے فتح کو لکھتے ہیں سر، قلم ہو کر

برہم نہ کرو کبھی ہوا کو
جاتے ہوئے اک نفس کی جا کو

آؤ کوئی تم میں رنگ بھر دُوں
اے یاد کے بے وجود خاکو!

ہے منظرِ مرگ، عبرتِ زیست
گر تم اسے تک سکو تو تاکو

چلتے رہو اُن کے ساتھ لیکن
منزل نہ کہو نقوشِ پا کو

مانو جسے ماننا ہے لیکن
موجود کبھی نہ سمجھو لا کو

میں لذتِ گمرہی کا مارا
کب تک رکھوں آگے پیشوا کو

میں وقت سے آگے جاچکا ہوں
اٹھتے نہیں ہاتھ اب دعا کو

یہ وقتِ شگفتِ گُل ہے شاید
دیکھا تو ہے اس طرف صبا کو

یاد اُس کو اگر کرو تو اتنا
پہنچے ظفر اپنی انتہا کو

دل جو دل کی نمط لگایا
پھر منہ اسے کیا غلط لگایا

جب بھی لکھا، حرفِ عشق لکھا
وہ مَیں نے قلم کو قط لگایا

کچھ بھی نہ تھا ورنہ اس جہاں میں
دل تیرے لیے فقط لگایا

دیکھا نہ کہ کیا لکھا ہے اس میں
آنکھوں سے تمہارا خط لگایا

ہے بھی کہ نہیں اسے محبت
اندازہ غلط سلط لگایا

اے بہتے فرات! یاد رکھنا
لب سے نہ تمہارا شط لگایا

ڈھونڈا ظفر آبجو کو پہلے
پھر مَیں نے سراغِ بط لگایا

تجھ میں ترا ناز ڈھونڈتا ہوں
جینے کا جواز ڈھونڈتا ہوں

آوازیں بہت ہیں اس جہاں میں
تیری آواز ڈھونڈتا ہوں

انجام جو ہوگا دیکھ لوں گا
فی الحال آغاز ڈھونڈتا ہوں

کچھ روشنی آسکے سخن میں
شمعِ الفاظ ڈھونڈتا ہوں

شاید ملے کھویا ہم سخن وہ
گم ہے جو بیاض، ڈھونڈتا ہوں

جو روح کے بھید بھاؤ جانے
وہ عشوہ طراز ڈھونڈتا ہوں

جو میری خبر ظفر مجھے دے
ایسا ہمراز ڈھونڈتا ہوں

وہ جو محرم تھے باغ میں گُل کے
آج گم ہیں سراغ میں گُل کے

گُل بکھرنے سے، ہو کے پژمردہ
میں ہوں روپوش داغ میں گُل کے

بجھ چکی ہے بہارِ گُلِ بدناں
جلے پت جھڑ چراغ میں گُل کے

تیرے رخسار آگے آن کھلا
کیا خلل تھا دماغ میں گُل کے

حوصلہ رکھ ظفر کہ باقی ہے
عرقِ گُل ایاغ میں گُل کے

تقصیر وہ خُوب کر رہے ہیں
تجدیدِ عیُوب کر رہے ہیں

وہ حشر گزشتگاں کا دیکھیں
اب جو مصلوب کر رہے ہیں

مجبور ہیں دل سے ہم کہ خود کو
تجھ سے منسوب کر رہے ہیں

عاقل کو علاقہ ہی نہیں ہے
عشق اب مجذوب کر رہے ہیں

ارسال ہم ایک ماہ وش کو
دل کا مکتوب کر رہے ہیں

اک دوجے کے ہم قریب ہوکر
تالیفِ قلوب کر رہے ہیں

جینے کی ظفر سبیل کیا ہو
وہ تو معتوب کر رہے ہیں

آخرت ہے نام جس کا وہ نفس آئندہ ہے
یعنی خاطر جمع رکھیے، اک قفس آئندہ ہے

یادِ ماضی کے شکنجے میں ہیں یوں ہوش و حواس
جو گزشتہ ہے وہی شاید برس آئندہ ہے

یہ جہاں گویا جہنم، ہے یہاں آزردگی
عیش فردا میں ہے، جنت کی ہوس آئندہ ہے

ہر دمِ ہستی ابھی تو ہے تغافل آشنا
خود پرست و خودشناس و خود بہ کس آئندہ ہے

بے نیازانہ گزارے زندگی صابر ظفر
مختنم ہے حال جو ہے، مُلتمَس[1] آئندہ ہے

[1] مُلتمَس (طلب شدہ)

بس تیرا ورود چاہتا ہوں
حلقہ محدود چاہتا ہوں

خواہش دیکھو، مجھ آئنے کی
پتھر سے نمود چاہتا ہوں

بِن تیرے، ظہورِ زندگی کیا
خود کو مفقود چاہتا ہوں

ہوں تنگ آوارگی سے اس کی
کچھ دل کی حدود چاہتا ہوں

دل بھاگ رہا ہے بندگی سے
چشمِ معبود چاہتا ہوں

جب اصل مقام آخرت ہے
کیوں بود و نبود چاہتا ہوں

پوچھو نہ ظفر یہ حالتِ عشق
ہر لمحہ شہود چاہتا ہوں

اگر ہمارا وطن ہے تو ہم کو جینے دو
وہ صاف ہے کہ وہ گدلا ہے پانی، پینے دو

نہیں ہیں اہلِ جنوں، اہلِ ہوش ہیں شاید
جو کہہ رہے ہیں گریباں کے چاک سینے دو

بدل رہے ہو اگر راستہ محبت میں
مری گزاری ہوئی عمر کے خزینے دو

بس التجا ہے ذرا سوچ کر قدم رکھیے
یہ مرگ وزیست ہیں، دونوں جہاں کے زینے دو[2]

وہ اک تو فیض تھے اور اک حبیب جالب تھے
مزاحمت کے چمکتے ہوئے نگینے دو[2]

ظفر ہو کچھ تو سرِ کربلا مری حرمت
مرے لہو سے بھرو اور آبگینے دو

اُن آنکھوں کی پُتلیاں پھِری ہیں
ہر قول سے جو یہاں پھِری ہیں

جا، خانۂ دل میں کاش ہوتی
یادیں، بے خانماں پھِری ہیں

اب رہ گیا لامکاں پہ پھرنا
آ، پیر، سرِ آسماں پھِری ہیں

اب تک ہیں امیدیں بے ٹھکانہ
حالانکہ ہر آشیاں پھِری ہیں

لپٹی نہیں ڈور خواہشوں کی
من چرخیاں، رایگاں پھِری ہیں

ٹھہرا درِ یار پر ہی آخر
میں نے کئی بستیاں پھِری ہیں

رکھا ظفر اپنا ہم نفس ساتھ
یہ سانسیں جہاں جہاں پھِری ہیں

فروخت کرتے چلے جاؤ اس زمیں کے ذخیرے
مگر نجانے کوئی کیوں، تمہارا سینہ نہ چیرے

سکوتِ مرگ اگرچہ ہزار سمت بچھا دو
مگر خموش نہ ہوں گے، مزاحمت کے مجیرے

میں جاںنثاروں کا ماتھا تو بڑھ کے چوم لوں اِک بار
پیام اجل کی سواری کو بھیجوں، آ ذرا دھیرے

کہ جیسے سمّو کا دیدار توکلی کو ہوا تھا
مل آ کے تختِ ہزارے میں رانجھڑے سے، نی ہیرے!

یہ زندگی تو مسلسل محاصرے میں ظفر ہے
کسی بھی دور میں بدلے نہ غاصبوں کے وتیرے

جب بھی ہُوا دھوپ میں روانہ
تھا تیرا خیال شامیانہ

دینا مرے عشق کی گواہی
ملنا وہ کسی کا والہانہ

ہر پل ہے ابھی تلک وہ ہر پل
گزرا نہیں عشق کا زمانہ

وارفتگی آج بھی وہی ہے
ہے اہلِ جنوں کا ہر زمانہ

اک ربط ہے اور ماورائی
اِک عشق ہے اور غائبانہ

مرنے نہیں دے رہا ہے مجھ کو
وہ اُس کا سلوکِ دلبرانہ

نازاں مَیں ظفر رہا اسی پر
ہر پل جو گزارا عاجزانہ

گلِ دوشیزگی میں سمانیے وصلِ وجودِ عشق
بصد نظّارہ ہو حیرت کشا رنگِ نمودِ عشق

اسے بھی دیکھنا جو چشمِ شاہد باز نے دیکھا
اترتا آبجوئے حسن میں چرخِ کبودِ عشق

نگاہِ توسنِ ہستی ٹھٹھک جاتی ہے ہر ہر جا
کہ ناممکن ہوا ہے پار کر لینا حدودِ عشق

بچھی تھی نطع[1] جس میں، وہ کوئی مقتل چُنیدہ تھا
نکل آیا سلامت مَیں وہاں سے، یہ تھا جُودِ عشق

اگر کارِ عبث کی آرزو دل کو ظفر چھیڑے
جلایا کیجیے شمعِ عشق، اچھالا کیجیے دودِ عشق

[1] کھال جو قتل کرنے کے لیے بچھائی جاتی ہے

دل جانے سے یُوں ملول ، ہو جا
ساتھ اس کے ہی خاک دھول ہو جا

میں تیرے وصال کی دعا ہوں
کیسے نہ کہوں، قبول ہو جا

پھرتا ہے ابھی وہ آبلہ پا
ہے وقت ابھی، ببول ہو جا

ہونے کا کوئی تو رکھ تعلق
تُو یاد نہیں تو بھول ہو جا

کیا وقتِ وداع بھی نہ بولوں
اے سُودِ وفا، وصول ہو جا

خوشبو ترے انگ میں رہے گی
بہتر ہے یہی کہ پھول ہو جا

کہتا ہوں ظفر کہ آیتِ عشق!
تُو نورِ شبِ نزول ہو جا

یہ بھی پوری ہوئی اغیار کی خواہش سرِ شام
خیمۂ دل کو جلاتی رہی آتش سرِ شام

رہتی ہے ان کی نمی رات گئے تک باقی
شبنم واشک جو کرتے ہیں تراوش سرِ شام

عصر کے بعد غریبانِ امم نے دیکھا
خوں فشانی ہوئی یعنی ہوئی بارش سرِ شام

شبِ عاشور نہ دیکھی گئی چشم نم سے
ہوئی اپنوں کے خلاف آخری سازش سرِ شام

پھر ظفر ڈوبتا سورج بھی ہوا سر بسجود
اور کی خونِ شہیداں کی پرستش سرِ شام

وہ چشمِ کرم بھی کیا ہوئی تھی
پُر عشق سے دل کی جا ہوئی تھی

بے رنگ نہیں تھی شامِ رخصت
نارنجی شفق عطا ہوئی تھی

بس اتنا ہے ماجرائے ہستی
رستے میں ترے، فنا ہوئی تھی

ہونے کی تھی اتنی نغمگی بس
جو لے تھی طرب کی، لا ہوئی تھی

بکھرا ہی ہمیشہ دل کو دیکھا
تعمیرِ حیات کیا ہوئی تھی

پھر اس سے ملوں تو یاد آئے
رغبت نہ ہوئی تھی یا ہوئی تھی

دو مجرمِ عشق جو ظفر تھے
کس کو کتنی سزا ہوئی تھی

تمہارے نام کی نسبت بھی چھیننے لگے لوگ
گلہ بھی کیا ہو کہ یہ اپنے بھی نہیں سگے لوگ

مری نظر میں ہیں غفلت کی نیند کے ماتے
ہزار بار جگایا مگر نہیں جگے لوگ

نہ آئے کوئی جو بولوں کہ راہِ حق ہے ادھر
یہ اپنے جہل کی ٹھگ بازیوں کے ہیں ٹھگے لوگ

اب ان کی راکھ کوئی پل میں اڑنے والی ہے
منا رہے ہیں جہنم میں بھی جو رتجگے لوگ

طرح طرح سے ظفر میری جاں کے درپے ہیں
یہ اپنے اپنے تصوّر کی دار پر ٹنگے[1] لوگ

[1] ضرورتِ شعری

محرم نہیں کوئی جاں بلب کا
میں نے تو سُنا تھا تُو ہے سب کا

تاریخ الگ ہے ہر کسی کی
دھندلا چکا واقعہ وہ کب کا

احساسِ جمال میرا مضموں
میں طالبِ علم ہوں ادب کا

بنیادِ وجود ڈھونڈتا ہوں
جب ذکر ہو شجرۂ نسب کا

کس کام کا میرے واسطے ہے
سایا دیوار کے عقب کا

محتاجِ نفس نہ ہوں گا جب مَیں
تب شکر ادا کروں گا رب کا

عشّاق کا شکوۂ بخیلی
طالب ہی نہیں ظفر طلب کا

اک دائرہ ہے درد کا اور چھاؤں درمیاں
دلدل ہو جیسے چاروں طرف، پاؤں درمیاں

اوجھل تھی ایک شکل جو نظروں کے بیچ تھی
میں اور قیس پھرتے تھے صحراؤں درمیاں

آتی ہے یاد اب بھی، اگرچہ اجڑ چکی
دنیا تھی ایک اپنی بھی، دنیاؤں درمیاں

ایسا نہ تھا نصیب کہ وہ پار جالگیں
کاغذ کی کشتیاں تھیں جو دریاؤں درمیاں

ہم دونوں ہی سے پیڑوں کی شاخیں الجھتی تھیں
جنگل تھا اردگرد ظفر گاؤں درمیاں

ہونے کا کوئی نشاں ہو شاید
شمشان میں استخواں ہو شاید

تصویرِ ہوائے گلستاں میں
طائر کوئی پَر فشاں ہو شاید

پھیلا ہے جو زہرِ اژدرِ عشق
باقی ابھی مجھ میں جاں ہو شاید

انبوہِ گزشتگاں جو گُم ہے
مجھ سا بے خانماں ہو شاید

سوکھی ہوئی ٹہنیوں کو دیکھوں
اب تک وہیں آشیاں ہو شاید

شکوہ نہیں کرتے بے پَری کا
یہ خُوئے پرندگاں ہو شاید

مطعون ہیں جِس کے کھولنے پر
اپنی بھی کبھی زباں ہو شاید

شاید کبھی زیرِ پا زمیں ہو
سر پر کبھی آسماں ہو شاید

اُڑتی ہوئی دھول جا کے دیکھوں
جاتا ہوا کارواں ہو شاید

آتی ہے مہک جو آشنا سی
بازیچۂ رفتگاں ہو شاید

کشتی تو ظفر نظر نہ آئے
بہتا ہوا بادباں ہو شاید

حاصلِ عشق ہو، ارے کچھ تو
دل میں اترو کہ دل بھرے کچھ تو

گفتگو کچھ تو ہو وصال آمیز
کان جس پر کوئی دھرے کچھ تو

کچھ ہَوا تو چلے محبت کی
دل کے پتّے بھی ہوں ہرے کچھ تو

بے نیازی بھی ٹھیک ہے لیکن
آدمی آرزو کرے کچھ تو

کچھ تو گردش اسی کی دی ہوئی ہے
آسماں سے زمیں ڈرے کچھ تو

گل بدن پھر وہ دھیان میں آیا
ہوئے پت جھڑ کے دن پرے کچھ تو

لذتِ مرگ و زیست چکھ دیکھی
کچھ تو ہم بھی جیے، مرے کچھ تو

ظفر اس نے رقیب جمع کیے
کھوٹے سکّے ہوے کھرے کچھ تو

روودادِ سفر، بدل گئی ہے
وہ راہ گزر، بدل گئی ہے

کیا دھوپ مَیں اپنی لے کے پہنچوں
پرچھائیں ہی گھر بدل گئی ہے

اب تک ہوں بنا ہوا تماشا
لیکن وہ نظر بدل گئی ہے

اب تک وہی چوکھٹا ہے دل کا
تصویر مگر بدل گئی ہے

وہ شاخِ وفا لپٹ کے مجھ سے
تاثیرِ ثمر بدل گئی ہے

جس طبع کے ساتھ خود کو بدلا
وہ بارِ دگر بدل گئی ہے

تم ہو کہ بدل نہیں رہے ہو
ہر چیز ظفر بدل گئی ہے

اگر کوئی خداوندِ خدا ہے
تو پھر کیوں سانس اکھڑتا جارہا ہے

نظر آتا نہیں قاتل کا چہرہ
عدالت ایک اندھا آئنہ ہے

وہاں پیاسوں کو مرتا کون دیکھے
جہاں آنکھوں کا پانی مرچکا ہے

نجانے کون کافر ہے کہ جس نے
مرا حرفِ دعا چھینا ہوا ہے

ظفر کوئی کہاں خیمہ لگائے
جدھر دیکھو ادھر ہی کربلا ہے

چپ ہونے پہ شور کھینچتا ہے
جیسے کوئی ڈور کھینچتا ہے

جو کھنچ نہیں پائے بارِ ہستی
وہ عشق کا زور کھینچتا ہے

بے سود ہے ہر لکیر گویا
قسمت کی وہ پُور کھینچتا ہے

میں پاس تو اُس کے ہُوں مگر وہ
آغوش کی اور کھینچتا ہے

عشّاق کا ہے یہی مقدر
غم جانبِ گور کھینچتا ہے

کھینچے وہ مجھے کہ چاند جیسے
سمت اپنی، چکور کھینچتا ہے

میں بھی ہوں ظفر اُسی کا چکّر
جس پہیے کو ڈھور کھینچتا ہے

اگر اس نظر نے تبسّم کِیا
تو سمجھوں گا مَیں، آپ میں گُم کِیا

نہیں تھا جو وہ میری تقدیر میں
تصوّر کیا تو توہّم کِیا

گریز اس کا دیکھا جو شب چشم نے
کِیا ایسے گریہ، تلاطم کِیا

غرور اس کا، جیسے خدا کا جلال
نہ دیکھا، نہ اس نے تکلم کِیا

کیا آخری سجدہ اس کو، ظفر
شہادت سے پہلے تیمّم کِیا

یہ خلوتِ شب ہے آخری کیا
لے لوگے ہماری جان ہی کیا

جو آپ کی جا ہے، پُر نہ ہوگی
اب کوئی کرے برابری کیا

تم جب بھی پکارتے، ہم آتے
آواز ہی دی نہ جاسکی کیا

اک پل کی تری نظر ہے کافی
کیا دائمی زیست عارضی کیا

اک دوجے کی خامشی جو سمجھیں
پھر ہو بھی لب کشا کوئی کیا

جو ساتھ مرے گزارنی تھی
وہ زندگی بھی گزار دی کیا

کیوں اِتنے بُجھے بُجھے ظفر ہو
جو آگ تھی راکھ ہوگئی کیا

جب آگ بھڑکے گی، حریتِ یقیں سے کہیں
ضرور پھوٹے گا لاوا کوئی، یہیں سے کہیں

سنائی دے گی کسی دن صدائے آزادی
سخن کو مَیں نے تو پہنچا دیا کہیں سے کہیں

تمہی کو بھاگنا ہوگا اٹھا کے زنجیریں
ہمیں تو جانا نہیں اپنی سرزمیں سے کہیں

کسی پہ وار سے پہلے خیال رکھیے گا
نکل نہ آئے کوئی سانپ آستیں سے کہیں

میں جان وارتا چوکس ہوں اپنی دھرتی پر
ہُوا ہے کیا کبھی سجدہ جدا، جبیں سے کہیں

سمیٹو درد کے ٹکڑے، بکھر نہ جائے یہ گھر
ظفر ہماری تمہاری نہیں نہیں سے کہیں

جب دُور غبار کیجیے گا
رستہ ہموار کیجیے گا

آگے تو صدائے زندگی ہے
خاموشی کو پار کیجیے گا

چاہو جو حیاتِ جاودانی
جاں واقفِ دار کیجیے گا

اجڑا تھا ہمارا دل اسی سے
مت ذکرِ بہار کیجیے گا

دل ٹوٹنے والا یہ نہیں ہے
کب تک انکار کیجیے گا

چاہے نہ نبھائیے گا لیکن
کچھ قول و قرار کیجیے گا

رکتے ہیں ظفر کے دل میں کب تک
لمحوں کو شمار کیجیے گا

گو بیاباں کی ہوا میری طرح آوارہ ہے
ڈھونڈ لے لیکن کوئی کھویا ہوا کب یارا ہے

دیکھ سکتا ہوں وہ نعشیں جو پڑی ہیں دور تک
اور آگے ہے دھندلکا، بس یہی نظّارہ ہے

میرے حصے میں تو آئی ہی نہیں ہے زندگی
کیا اجل کے ہاتھ سے، سانسوں کا یہ بٹوارا ہے؟

تیز تر سازِ نفس کو رکھ سکو جتنا، رکھو
زندگی کی آخری آواز بھی نقّارہ ہے

کیا بتائیں ہم تمھیں تفصیلِ اسبابِ سفر
من مسافر کو غمِ ہستی ہی اک پشتارہ ہے

جان دینے میں اگرچہ دیر ہم سے ہو چلی
آتشِ سوزِ جنوں سے تن مگر انگارہ ہے

کوہساروں سے جھلکتا ہے ظفر وہ باغ سا
جانثاروں نے اچھالا جو لہو، فوّارہ ہے

بکھرے، جتنا بکھر سکے ہم
پر جاں سے نہیں گزر سکے ہم

تھے یاد، بھلا دیئے گئے تھے
بس یہ فریاد کرسکے ہم

خود سو گئے زیرِ خاک لیکن
کب ہجر کی لوح بھرسکے ہم

پہنچی جو تری سماعتوں تک
کب آہ کے سنگ مرسکے ہم

آوازِ شکستِ آرزو تھی
اکثر جسے سن کے ڈر سکے ہم

گردش تو زمین کر رہی تھی
ٹھہرے بھی تو کیا ٹھہر سکے ہم

عشق آخری حد تھی زندگی کی
پار اس کو ظفر نہ کرسکے ہم

ملا نہ وقت کوئی اور بندگی کے لیے
تمام عمر فقط سجدہ ہائے سہو کیے

غلام ہو وہ تمھی پاسبان کے، جس نے
تمہارے ہاتھ بھی باندھے، تمہارے لب بھی سیے

تمہارے جیسے ہی اب رہ گئے ہیں درباری
اگر یہاں کوئی سقراط ہو تو زہر پیے

غنیمِ شہر کے قدموں میں تم تو مر رہے ہو
میں ان کو ڈھونڈ رہا ہوں جو سر اٹھا کے جیے

ظفر وہ تیرہ نصیب، آشرم میں کیا پہنچیں
جلا کے راکھ کریں جن کو معبدوں کے دیئے

جائیں گے کہاں، یہیں رہیں گے
مٹی سے الگ نہیں رہیں گے

آنکھوں میں اگر رہا نہ کوئی
آنسو مرے بالیقیں رہیں گے

نیلاہٹیں درد کی وہ ہوں گی
رنگ اپنے جو نیلمیں رہیں گے

ہیں تیرے، ازل سے نام لیوا
ہم اوّلیں، آخریں رہیں گے

کچھ ٹھہریں گے زندگی کے ضامن
کچھ مارِ آستیں رہیں گے

ہر جا تو ظفر خدا رہے گا
ہم لوگ کہیں کہیں رہیں گے

مجھے تو یاد نہیں مَیں نے کیا دعا کی تھی
مگر خدا نے محبت مجھے عطا کی تھی

جسے مَیں بھول چکا تھا، کیا تھا یُوں اُسے یاد
قضا نماز کوئی جس طرح ادا کی تھی

بندھا ہوا تھا جو اک اجنبی کی پوروں سے
ملایا مجھ سے بھی ہاتھ، اتنی تو وفا کی تھی

پکارا نام مرا اور اتر گیا دل میں
اگرچہ آنکھوں نے خاموش التجا کی تھی

بتانے آیا تھا مجھ کو، مَیں جا رہا ہوں ظفر
لرزتے ہونٹوں سے بات اور جانے کیا کی تھی

جب تجھ سے ہُوا کچھ آشنا مَیں
پھر خود سے کبھی نہیں ملا مَیں

کیا جانیے، کس کی جستجو تھی
آواز کی لہر پر چلا مَیں

عشاق کے قافلوں کو اک دن
منزل کی طرف پڑا ملا مَیں

شاید کوئی خضر آن پہنچے
رستے میں کئی جگہ رکا مَیں

میں چھو نہ سکا تجھے تو کیا ہے
منسوب تجھی سے تو ہُوا مَیں

کیا دن تھے، چمن میں مثلِ خوشبو
پھرتا تھا ظفر اُڑا اُڑا مَیں

تم تو سرگرم ہو، شعلوں کو ہوا دینے میں
میرا مولا بڑا دھیما ہے سزا دینے میں

کاسہ ایمان کا، مت پوچھیے کیسے لرزا
ایک بُت لینے میں اور ایک خدا دینے میں

خاک ہوجاتے ہیں ہم جیسے وفا پیشہ لوگ
تُو بہت دیر لگاتا ہے صلہ دینے میں

کرتے ہم آخری درخواست پلٹ آنے کی
سانس ہی ساتھ نہ دیتا تھا صدا دینے میں

جانے کیا دوسرے لوگوں کے دلوں میں ہے ظفر
ہم تو مصروف ہی رہتے ہیں دعا دینے میں

درماندہ و دریدہ جو پہلو سے دل گیا
وقتِ رفو ، لباسِ جُدائی میں سِل گیا

شاید تھا وہ تحیّرِ خلوت کا آدمی
اُترا فلک سے خوار ، زمیں سے خجل گیا

اُٹھّا اگر وہ درد سا ، بیٹھا وہ گرد سا
بھولے سے بھی جو تیری طرف مشتعل گیا

ہے مختصر ترین یہ رودادِ زندگی
آیا یہاں جو زور سے ، وہ مضمحل گیا

حُسنِ حکایتِ دلِ جاناں کو جاننے
اِک بار اُدھر گیا تو ظفر مستقل گیا

ہر پل کسی امتحاں سے گزرا
گزرا جو یہاں سے، جاں سے گزرا

ہر رت ہی بغاوتوں کی رت تھی
میں موسمِ خوں فشاں سے گزرا

لاشوں سے گزر رہے تھے لشکر
میں زندہ جہاں جہاں سے گزرا

ماضی سے گزر کے سوچتا ہوں
کیوں عرصۂ رائگاں سے گزرا

سُنتا ہوں گزر گیا زمانہ
معلوم نہیں کہاں سے گزرا

ٹھہرا مرا بے وجود ہونا
میں خاکِ گزشتگاں سے گزرا

تم جانے کہاں چلے گئے تھے
جس روز ظفر یہاں سے گزرا

صابر ظفر کے مطبوعہ شعری مجموعے

1 - ابتدا (غزلیں)
2 - دُھواں اور پھول (غزلیں)
3 - پاتال (غزلیں)
4 - جتنی آنکھیں اچھی ہوں گی (گیت)
5 - دریچہ بے صدا کوئی نہیں ہے (غزلیں)
6 - لہو ترنگ (گیت اور غزلیں)
7 - دُکھوں کی چادر (گیت اور غزلیں)
8 - بارہ دری میں شام (غزلیں)
9 - عشق میں روگ ہزار (غزلیں)
10- اک تری یاد رہ گئی باقی (غزلیں)
11- بے آہٹ چلی آتی ہے موت (غزلیں)
12- چین اِک پل نہیں (گیت اور غزلیں)
13- اپنے رنگوں میں ڈوب جانے دے (غزلیں)
14- محبّت کا نیل کنٹھ (غزلیں)
15- کوئی لَو چراغِ قدیم کی (غزلیں)
16- نامعلوم (غزلیں)
17- پرندوں کی طرح شامیں (غزلیں)
18- محبّت دُور کی آواز تھی (غزلیں)
19- سانول موڑ مہاراں (غزلیں)
20- زندان میں زندگی امر ہے (غزلیں)
21- خاموش بدن کی خود کلامی (غزلیں)
22- ہر چیز کلام کر رہی ہے (غزلیں)
23- ستارہ وارِ سخن (غزلیں)
24- آئینوں کی راہداریاں (غزلیں)
25- غزل خطاطی (غزلیں)

26- اباسین کے کنارے (غزلیں)

27- صندل کی طرح سُلگتے رہنا (غزلیں)

28- سب اپنے خیال کی دھنک ہے (غزلیں)

29- غزل اندر غزل (غزلیں)

30- گردشِ مرثیہ (ایک طویل غزل)

31- پلکوں میں پروئی ہوئی رات (غزلیں)

32- سرِ بازاری رقصم (ایک طویل غزل)

33- جمالِ ماورائے جسم وجاں (غزلیں)

34- رانجھا تختِ ہزارے کا (ایک طویل غزل)

35- اساطیرِ کم نما (غزلیں)

36- آوارگی کے پَر کُھلے (غزلیں)

37- غزل نے کہا (ایک طویل غزل)

38- لہو سے دستخط (غزلیں)

39- شہادت نامہ (غزلیں)

40- روحِ قدیم کی قسم (غزلیں)

41- آواز کی لہر پر چلائیں (غزلیں)

مطبوعہ شعری انتخاب

1- صابر ظفر کی مزاحمتی شاعری

2- اُڑان

3- پل دو پل کی چاہت میں

4- ترے عشق نے مالا مال کیا

5- محبت ہو نہیں پائی

6- محبت کا عہد نامہ

مطبوعہ کلیاتِ صابر ظفر

1- مذہبِ عشق (جلد اوّل)

(پہلے دس مجموعہ ہائے غزل)

صابر ظفر کی غزل میں فطرت سے ایسی قرابت داری نظر آتی ہے جو اپنا انوٹ تعلق نہ بنانے کے باوجود اپنا اظہار یُوں کرتی ہے کہ موت اور محبت لازم و ملزوم نظر آتے ہیں۔

پھر اس کے ساتھ ہی کربِ تنہائی کہ جس سے فرار غیر ممکن ہو، حاصل کی نزاکت، انسلاک و وابستگی کی لایعنیت و بے یقینی اور ان سب کے درمیان فرحت کی مختصر مگر قیمتی ساعتیں ہیں۔

ان تمام صورتوں کے واضح اظہار میں مظہر کا کنایت شعار نظر آنا صابر ظفر کا خاصہ ہے، جو خود کو برگشتہ محسوس کرتے ہیں۔

اس برگشتگی و تحریف کی جدید ادب سے بے حد مطابقت کی واضح مثال صابر ظفر کے مصرے میں ''جمگھٹے میں کھو جانا'' ہے

میں ایسے جمگھٹے میں کھو گیا ہوں
جہاں میرے سوا کوئی نہیں ہے

یہ بڑھتے ہوئے تصورات سے بڑھ کر محسوسات کو دو مصرعوں میں ڈھال دینے کی شاعری ہے اور بلا شبہ موثر طور پر اپنی ذات کا یہ اظہار ان کی شاعری میں پروان چڑھتا جا رہا ہے۔

محمد سلیم الرحمٰن

(The Quote has been taken from THE PAKISTAN TIMES)

